علمِ منطق ـــــ ایک جائزہ

(۳)

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل، ایل، بی
سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش
علی گڑھ

منطق کا تدوینی پس منظر

منطق بقول مختار حکمت (فلسفہ) ہی کا ایک حصہ ہے، لہذا اس کا تاریخی جائزہ مرتب کرنے سے پہلے خود فلسفہ کے آغاز و ارتقا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لینا ضروری ہے۔ لیکن اس سے بھی پیشتر اس قسم کی تحقیقی کاوشوں کے بنیادی اصولوں کی طرف توجہ دلانا مستحسن ہے۔

تحقیقی کاوش کے بنیادی اصول

۱۔ تحقیقی کاوش کا اولین بنیادی اُصول یہ ہے کہ

ہر کسے را بہر کارے ساختند

اگر محدث حدیث اور علوم حدیث کی خدمت کے لئے ہے تو منطقی منطق اور دیگر علوم حکمیہ سے متعلق افہام و تفہیم کے لئے اور ادیب تحقیق لغات اور دوسرے ادبی نکات کی تحقیق کے لئے۔

اسی طرح عربی مدارس کے فضلاء، ممالک اسلامیہ میں پروان چڑھنے والے علوم سے متعلق تحقیقات کے لئے ہیں اور یورپی محققین و فضلاء اپنے براعظم کے اندر ماضی قریب

اور ماضی بعید میں پیدا ہونے والے اور ترقی پانے والے علوم کے لئے۔ ہاں اگر کوئی جامع کمالات علمیہ ہی بننا چاہے تو اسے دوسرے ممالک کے علوم میں بھی تبحر و تمہر کا حق ہے جیساکہ یورپی ماہرین اکتشافات نے کیا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ

تکیہ برجائے بزرگاں نتواں زد بگزاف
مگر آنگاہ کہ اسبابِ بزرگی ہمہ آمادہ کنی

اس لئے یہ کوئی علمی تحقیق نہ ہوگی کہ ایران و توران کے شوق میں عراق و عرب بھی نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ قدیم یونان، قدیم ہندوستان اور قدیم ایران کی فلسفیانہ سرگرمیوں کے قلمبند کرنے کا تو شوق ہو، مگر خود جو درسی کتابیں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں، انھیں نقش و نگار طاق نسیاں بنادیں۔ اس کے بعد ہی کہا جائے گا کہ

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

۲۔ اس سلسلہ کا دوسرا اصول ہے کہ

صاحب البیت ادریٰ ما فی البیت

لہذا اگر کسی عربی مدرسے کا فاضل علوم اسلامیہ کے باب میں مستشرقین یورپ کے مقابلے میں اپنے اکابر کی رائے کو ترجیح دے، تو اصولاً اسے ایسا کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یورپ کے فضلائے محققین کے اس حق کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ دوسرے ممالک کی قدیم و جدید علمی سرگرمیوں کے بارے میں مورخین اسلام کے اساطیر العجائز قسم کے افسانوں کے مقابلے میں آراء و تحقیقات کو ترجیح دیں جن تک وہ بڑی صبر آزما و تاب فرسا کاوشوں کے بعد پہونچے ہیں، بالخصوص جبکہ انھیں ہمارے قدیم مورخین کے مقابلے میں اس تحقیق کے زیادہ مواقع حاصل تھے۔

اس لئے شہرستانی و ابن القفطی یا نویری کے افادات عہد اسلام کی علمی و فکری سرگرمیوں کے باب میں یقیناً مرجع ہیں، مگر قدیم یونان و ہندوستان کی ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں

ان کی روایات قصص العجائز سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

اس تبصرے سے حاشا وکلا ان بزرگوں کی صحت بیانی کا استخفاف مقصود نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے یہودی وسریانی مآخذ سے جو کچھ سنا اُسے بعینہٖ نقل کر دیا۔ اصل افسانہ تراشی تو ان یہودی وسریانی مصنفین نے کی جن کی "اسرائیلیات" نہ صرف تحقیق پسند علمائے اسلام ہی میں مشکوک سمجھی جاتی تھیں، بلکہ جدید تحقیق نے بھی انھیں مسترد کر دیا ہے۔

اس بات کی مزید تحقیق تین سوالوں کا محققانہ جواب چاہتی ہے۔

الف۔ کیا فلسفہ بالخصوص یونانی فلسفہ انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیمات سے مستفاد ہے؟

ب۔ کیا یونان میں فلسفہ مشرق بالخصوص ایران سے پہونچا، جس کا قدیم ایرانی بڑی شدومد سے دعویٰ کرتے تھے؟

ج۔ ہندوستانی فلسفے کے متعلق مسلمان مورخین کے بیانات کہاں تک قابل اعتماد ہیں؟

مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) پہلے سوال کے سلسلے میں مشہور مورخ فلسفہ ولہلم نیسل لکھتا ہے:

> اسکندری اسکول کے یہودیوں نے دوسری صدی قبل مسیح میں یہ دعویٰ شروع کیا کہ یہ حکیمانہ تعلیم ان کے نبیوں اور صحیفوں سے لی گئی ہے عیسائی مصنفین کلیمنٹ اور یوسیبوس سے لیکر ازمنہ وسطیٰ کے اختتام تک یہودیوں کے اس دعوے کی حمایت کرتے رہے۔"(۱)

اور پھر ان دعووں پر تبصرہ کرتے ہوئے ولہلم نیسل کہتا ہے:

---

(۱) مختصر تاریخ فلسفہ یونان

"اب عام طور پر یہودیوں کے ان قصوں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا"(۱)

اور ولہلم نیسل کا یہ تبصرہ قرین قیاس بھی ہے۔ مثلاً ابن القفطی نے فیثاغورث کے بارے میں لکھا ہے:

"واخذ الحکمۃ عن اصحاب سلیمان بن داؤد النبی بمصر حین دخلوا الیھا من بلاد الشام"(۲)

اُس نے (فیثاغورث نے) حضرت سلیمان بن داؤد پیغمبر علیہ السلام کے اصحاب سے حکمت کو سیکھا جبکہ وہ شام کے شہروں سے مصر میں داخل ہوئے

لیکن (۱) ایک دیندار مسلمان کے نقطۂ نظر سے سلیمان پیغمبر علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تعلیم وہی تھی جسے لے کر تمام انبیائے کرام مبعوث ہوتے رہے ہیں یعنی "توحید ربوبیت" چنانچہ قرآن کریم کہتا ہے:

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون

ہم نے کوئی رسول آپ سے قبل نہیں بھیجا مگر اسکو وحی کے ذریعہ مطلع کر دیا کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے بس میری ہی عبادت کرو۔

اور (۲) تاریخ کے طالب علم کے نقطۂ نظر سے سلیمان علیہ السلام کا صحیفہ "امثال سلیمان" کے نام سے تورات میں موجود ہے۔

اُدھر فیثاغورثی حکمت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مبدء اولین کائنات "عدد" ہے۔

اس کے بعد بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا قرآن کریم میں مذکور "توحید ربوبیت" یا "امثال سلیمان" میں مذکور "تمہیدات خداوندی" اور فیثاغورثی حکمت میں جو تناسخ یا

---

(۱) مختصر تاریخ فلسفہ یونان

(۲) ابن القفطی: تاریخ الحکماء ص ۲۵۸

آواگون کی تعلیم پر مشتمل ہے، کوئی مناسبت ہے۔

اگر کوئی مناسبت نہیں ہے ـــــ اور واقعتاً کوئی مناسبت نہیں ہے ـــــ تو پھر یہ کیسا اخذ و استفادہ ہے؟ کیا اپنے اساتذہ (اصحاب سلیمانؑ) کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر، ملحدانہ ہرزہ سرائی کرنے کے بعد (جس کی تفصیل کسی بھی فلسفہ کی تاریخ سے مل سکتی ہے) نیز توحید ربوبیت سے بے اعتنائی برتنے کے بعد فیثاغورث کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اصحاب سلیمان علیہ السلام سے اخذ و استفادہ کیا ہوگا۔

(ب) اس سے بھی ناکارہ تر مفروضہ یہ ہے کہ یونانی فلسفہ اقوام مشرق سے لیا گیا ہے چنانچہ پہلے تو... تو ولہلم نیسل اس عقیدے کے علمبرداروں کے بارے میں لکھتا ہے:

"ابھی تک اس خیال کے بہت سے حامی ملتے ہیں کہ یونانی فلسفہ مشرق سے آیا۔"

اس کے بعد وہ کہتا ہے: یہ صحیح ہے کہ ریاضیات اور فلکیات کے ابتدائی عناصر یونانیوں نے مشرق سے حاصل کئے، لیکن دلائل سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے فلسفیانہ تعلیمات اور اسالیبِ تحقیق مشرق سے سیکھے۔

اس سلسلے میں وہ مندرجہ ذیل حقائق پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے:

(۱) واقعات زیر بحث کے جس قدر قریب ہوتے جاؤ، اسی قدر مصنفین اس کی نسبت خاموش ہوتے جاتے ہیں، اور جس قدر ان سے دور ہٹتے جاؤ، اسی قدر اس رائے کو تقویت ہوتی جاتی ہے۔ جیسے جیسے یونانی دور کی مشرقی اقوام سے واقف ہوتے جاتے ہیں، ویسے ویسے ان کے فلاسفہ کے مفروضہ استادوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔

(۲) اگر یونانی فلسفہ کا مشرقی افکار پر مبنی ہونا اس بنا پر قرار دیں کہ ان کے مابین مماثلت پائی جاتی ہے تو تاریخی حیثیت سے ان کی معین صورتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ـــــ اور بعد کی تاویلات سے قطع نظر کرنے پر ـــــ یہ دھوکا رفع ہو جاتا ہے، اور

یہ مماثلت فقط ایسی باتوں میں باقی رہ جاتی ہے، جن کی نسبت یہ توجیہ ضروری نہیں رہتی کہ یونانی فلاسفہ نے کلاً یا جزءً اپنا فلسفہ مشرقی مآخذ سے لیا ہو۔

(۳) اسکندر کے زمانہ تک یونانیوں کا جن مشرقی اقوام سے میل جول ہوسکتا تھا، ان کے ہاں صنعات تو تھی، لیکن فلسفہ نہیں تھا۔ ان میں سے کسی قوم نے اشیاء کی فطری توجیہ کی ایسی کوشش نہیں کی تھی، جو یونانی فلاسفہ کے لئے نمونہ کا کام دے سکتی۔

(۴) اگر ان (مشرقی) قوموں میں کسی قسم کا فلسفہ تھا بھی تو زبان کی مشکلات کی وجہ سے اس کا حصول یونانیوں کے لئے مشکل تھا۔

(۵) یونانی فلسفہ پر ان کی مخصوص قومیت کے خط وخال نمایاں ہیں۔

(۶) اس (یونانی فلسفہ) کے قدیم ترین نمایندوں میں بھی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی، جو اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے، جن کے پاس کوئی علم کہیں باہر سے آتا ہے۔ نہ کوئی ملکی اور غیر ملکی عناصر کا تصادم معلوم ہوتا ہے، نہ بے سمجھے بوجھے اصول استعمال کئے جاتے ہیں اور نہ روایت کو غلامانہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

(۷) اہل ایشیا میں علم بالکل مذہب پیشہ لوگوں کا اجارہ تھا، اس لئے وہ مذہبی روایات و ادارات پر منحصر تھا۔ لیکن یونانی فلسفہ شروع ہی سے آزاد تھا، اور جس قدر قدیم زمانہ کی طرف جائیں، اُن کی قوم پروہتوں کی مخصوص جماعت سے خالی ہوتی جاتی ہے۔

(۸) ارسطو یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ مصری ریاضیاتی علوم کے بانی تھے، لیکن وہ مصری یا ایشیائی فلسفہ کا ذکر نہیں کرتا، حالانکہ وہ خاص طور پر متاخرین کے نظریات کو متقدمین فلاسفہ کی تعلیم میں تلاش کرتا ہے۔

اس لئے یہ کوشش کہ یونانیوں کی فلسفیانہ سرگرمیاں، مفکرین مشرق کی خوشہ چینی کا نتیجہ تھیں، بیش از خوش فہمی نہیں ہے۔

رہا ایرانیوں کا یہ دعویٰ کہ سکندر نے ایرانیوں کے علوم کو یونانی میں منتقل کرانے

کے بعد ان کی اصل کو جلا ڈالا تھا اپنی ثقافتی بے مائگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے جو وہ نوبخت (مصنف کتاب الشہمطان) کے زمانہ سے کرتے آئے ہیں۔

(ج) اور جہاں تک ہندوستانی فلسفہ کے متعلق مسلمان مورخین کے بیانات ہیں، وہ

جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

کی بیّن مثال ہیں۔ اس کی وضاحت اُس قصہ سے ہوگی جو مضمون نگار نے نویری کی "نہایۃ الارب" سے نقل کیا ہے[1] کہ جب سکندر نے اپنے دربار کے حکماء فلاسفہ کو راجہ "کنگ کانگ" کے پاس بھیجا تو اس نے بتایا کہ ہم نے اپنے فلسفیانہ علوم کو نہایت مرکز طریقہ پر چار قسموں میں بانٹ دیا ہے: پہلا ریاضیات، دوسرا منطقیات، تیسرا طبیعیات اور چوتھا الٰہیات۔ پھر علم منطق پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ علم منطق کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ شعر ۲۔ خطابت ۳۔ جدل ۴۔ برہان ۵۔ مغالطہ۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ روایت تنقید رواۃ کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے؟ کیا اس کے راوی عبدالملک بن عبدون کی شخصیت اتنی معتبر ہے کہ ان کی روایت کو درایت کا لحاظ کئے بغیر واقعہ نفس الامری سمجھ لیا جائے اور آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا جائے۔

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو کیا مضمون نگار کی ذمہ داری نہ تھی کہ اس کی بنیاد پر قیاس آرائی کی عمارت تعمیر کرنے سے پہلے اس کی روایت کو درایت کی کسوٹی پر کس لیتے؟ بالخصوص جبکہ اُن کے پیش نظر رائے بہادر اوجھا کی کتاب "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" نیز "قدیم ہندوستان" رہی تھیں۔ ان کتابوں سے قدیم ہندوستان کے تعلیمی نظام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً خود مضمون نگار کی نقل کے مطابق جامعہ نکشلا

۱۔ برہان، فروری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۰۳، سطر ۱۳-۱۷

میں وید ویاکرن، صناعی، فن حرب، ہاتھ کے علم، منتروں کے علم اور علم شفا کے علاوہ "اٹھارہ علوم" اور پڑھائے جاتے تھے۔[1]

یقیناً اور بھی تعلیمی اداروں میں کچھ ایسا ہی نصاب مروج تھا۔ بہرحال قدیم جامعات ہند کے کسی ماہر نے اس قسم کے نظام تعلیم کی نشاندہی نہیں کی جس کی رو سے فلسفیانہ علوم کو ریاضیات، منطقیات، طبعیات اور الہیات کی چار مرکز قسموں میں بانٹ دیا گیا ہو۔

پھر منطق کے مسائل و مباحث جو قدیم ہندو فلسفیانہ اسکولوں میں زیر درس تھے، ان کی تفصیل بھی رائے بہادر اوجھا کی کتاب میں مذکور ہے[2] اور ان مسائل کی کسی اسکیم میں شعر، خطابت، جدل، برہان اور مغالطہ کی اقسام پنجگانہ کا جنھیں نہایۃ الارب کے راوی نے ذکر کیا ہے، کہیں پتہ نہیں چلتا۔

دوسری جانب دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ریاضیات، منطقیات، طبعیات اور الہیات میں علوم کی تقسیم شیخ بوعلی سینا کی فلسفیانہ تصانیف کا عام دستور ہے چنانچہ "کتاب الشفا" انھیں چار قسموں میں منقسم ہے "نجاۃ" اور "دانشنامہ علائی" کے بھی یہی چار اجزاء تھے۔ اگرچہ بعد میں حصہ ریاضیات نکال دیا گیا۔ بعد میں فلسفہ کی کتابیں منطق، طبعیات اور الہیات کی اقسام ثلاثہ پر مشتمل ہوا کرتی تھیں چنانچہ اثیر الدین ابہری کی "ہدایہ الحکمہ" انھیں تین قسموں پر مشتمل ہے۔ عہد حاضر میں مولانا عبدالحق خیرآبادیؒ نے "زبدۃ الحکمہ" اردو میں لکھی اور یہی انداز باقی رکھا۔

اسی طرح شعر، خطابت، جدل، برہان اور مغالطہ ارسطاطالیسی منطق کے "مواد" کے اجزاء پنجگانہ ہیں۔ یہ حقیقت مضمون نگار کے علم میں بھی ہے، بلکہ انھوں نے اس حقیقت

۱۔ برہان، فروری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۰۸ سطر ۱۹۔ ۲

۲۔ برہان، فروری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۰۴ سطر ۲۰ تا صفحہ ۱۰۶ سطر ۱۱

سے تغافل برتنے پر ڈاکٹر احمد امین اور ڈاکٹر ذکی نجیب[1] جیسے فحول فضلائے وقت پر سرزنش بھی کی ہے۔ مگر خود اس سے کہیں زیادہ سادگی و سادہ لوحی کا اظہار فرمایا۔ فیا للعجب!

بہرحال یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ نویری یا اس کے راوی عبدالملک بن عبدون نے افسانہ تو گڑھ دیا، مگر اس کے کرداروں کو لباس اپنے ہی زمانہ کا پہنایا: یعنی سترہ سو سال پہلے کے ہندوستان کی درسگاہوں میں وہی نصاب مروج بتایا جو آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی مسیحی) کے عربی مدارس میں فلسفہ کا مروج تھا اور منطق کے وہی اجزاء بتائے جو اس کے عہد کی مروجہ منطقی کتابوں کے اندر متداول تھے۔ اس کے ساتھ اسے یقین بھی تھا کہ کون قدیم ہندوستان کے مدارس کے نظام اور نصاب کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کرنے بیٹھے گا اور اس توقع کو ہمارے مضمون نگار نے پورا کر دیا کہ "اعجوبہ تراشی" کی دھن میں از روئے درایت اس افسانہ کی تنقید نہیں کی، حالانکہ کم از کم رائے بہادر اوجھا کی "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" نیز "قدیم ہندوستان" ان کے مطالعہ میں تھیں، پھر بھی انھوں نے ان حاطب اللیل حضرات کے بے سروپا افسانوں کو کالوحی المنزل من السماء سمجھ لیا۔

۳۔ تحقیقی کاوش کا تیسرا بنیادی اصول ہے

سند عالی کی طلب

اسی "سند عالی" کی خاطر محدثین کرام متونِ حدیث سے واقف ہونے کے بعد سماع کی ہوئی اسناد سے زیادہ عالی اسناد کے لئے دور دراز ممالک کا سفر کیا کرتے تھے۔ اور جس طرح حدیث میں "سندِ عالی" کی تلاش و جستجو مستحسن ہے، دیگر علوم منقولہ میں بھی اس کی ایسی ہی اہمیت ہے۔ ثانوی ذرائع معلومات پر اکتفا کر لینا جب کہ خود ان کے مآخذ

۱۔ برہان جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۱، سطر ۸—۱۶

دستیاب ہو سکتے ہوں، کوتاہی فکر و عمل کی دلیل ہے۔

قدیم یونانی فلسفہ کی تاریخ کے موضوع پر جرمن اور فرنچ زبانوں میں کافی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ انگریزی میں بھی ان کا بڑا سرمایہ موجود ہے، جس میں سے بعض کتابوں کا اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے انہیں نظر انداز کر کے عبداللہ آفندی وغیرہ کی کتابوں پر غیر مشروط اعتماد کر لینا کوئی امر مستحسن نہیں ہے۔ ان حضرات کی حیثیت عہد حاضر کی تحقیقات کے پیش نظر حاطب اللیل سے زیادہ نہیں ہے۔

اسی کوتاہیٔ مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ ان حاطب اللیل حضرات کی سند پر مضمون نگار نے اکابر فلاسفۂ یونان کے بارے میں بہت سے بے بنیاد اور مضحکہ خیز واقعات لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً دیمقراطیس حکمائے یونان میں صف اول کا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ مادیین (Materialists) تو اسے شریعتِ مادہ پرستی کا بانی قرار دیتے ہیں چنانچہ (Lange) نے اپنی "تاریخ مادیت" کا افتتاح اسی دیمقراطیس سے کیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ اجزائے دیمقراطیس یا اجزائے لایتجزیٰ (Atoms) کی تجویز ہے۔ اس کی عظمت فکر کے صرف فضلائے یورپ ہی معترف نہیں ہیں، بلکہ مورخین اسلام بھی اس کے علمی کارناموں سے واقف ہیں، چنانچہ ابن القفطی اس کے بارے میں لکھتا ہے۔

دیمقراطیس: فیلسوف یونانی صاحب مقالہ فی الفلسفۃ۔ متصدر فی زمانہ لافادتہ ھذا الشان بارض یونان۔ وقولہ مذکور فی مدارس علومھم ھناک .... وھو القائل بانحلال الاجسام الی جزء لا یتجزیٰ۔"[1]	دیمقراطیس یونانی فلسفی تھا جو فلسفہ کے ایک مستقل مذہب فکر کا بانی ہے۔ اپنے زمانہ میں ملک یونان کے اندر اس علم کی تعلیم دینے میں مشغول ہوا۔ وہاں اُن کے مدارس علمیہ میں اس کے مذکور الصدر قول کا ذکر ہوا کرتا تھا.... اس کا قول ہے کہ اگر اجسام کا تجزیہ کیا جائے تو

۱۔ ابن القفطی: تاریخ الحکماء، ص ۱۸۲

وہ بالآخر اجزار لایتجزیٰ پر ختم ہوتا ہے۔

اسی طرح ابن جلجل "طبقات الاطباء والفلاسفۃ" میں (جو ابن القفطی وغیرہ کا ماخذ ہے) لکھتا ہے:

دیمقراطیس: رومی اغریقی کان الغالب علیہ الفلسفۃ وھو القائل باجزاء لا تتجزأ۔[1]

دیمقراطیس یونانی نسل کا رومی ہے۔ اس پر فلسفہ غالب تھا۔ وہ اجزار لایتجزیٰ کا قائل ہے۔

مگر مضمون نگار نے اس کی عظمتِ فکر اور ذہانت وعبقریت کے ثبوت میں یہ مضحکہ خیز واقعہ قلمبند کیا ہے:[2]

"دیمقراطیس بڑا نکتہ شناس تھا جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جسے عبداللہ آفندی نے نقل کیا ہے کہ بہت زیادہ ہنسنے کی وجہ سے لوگوں کو اس کی دماغی خرابی کا شبہ ہوا۔ تو انھوں نے بقراط حکیم کو دوا کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے جب دودھ کا پیالہ پیش کیا تو دیمقراطیس نے کہا کہ یہ دودھ تو پہلی مرتبہ بچہ جننے والی بکری کا ہے جس پر تمام لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔ غرضیکہ ایسے شخص نے علم منطق جیسے نئے اور مشکل الحصول علم کے مل جانے کے بعد اس میں جدت طرازی سے کام نہ لیا ہو یا اپنے تلامذہ کو اس علم سے استفادہ کا موقعہ نہ دیا ہو، بعید از قیاس ہے۔"

ان دلخوش کن افسانوں سے مضمون نگار کے سلیقۂ نگارش کا اندازہ لگایا جا سکتا

۱۔ ابن جلجل: طبقات الاطباء والحکماء صفحہ ۳۳

۲۔ برہان دسمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۸۲ سطر ۱۱-۱۲

ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

فلسفہ و منطق کا آغاز و ارتقا

فلسفہ کب اور کہاں پیدا ہوا، یہ ایک لاحاصل بحث ہے ہر قوم اور ہر ملک کا دعویٰ ہے کہ فلسفہ کا آغاز اسی کے یہاں ہوا اور ان بظاہر متضاد دعاوی میں ایک حد تک صداقت بھی ہے، کیونکہ فلسفہ بقول جیمز، منظم انسانی فکر کا نام ہے(1) اور جیسا کہ کننگھم کہتا ہے، وہ انسان کی حیاتِ تفکیری کا ایک ناگزیر تقاضا ہے(2)، اس لئے یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان میں سوچ بچار کا ملکہ۔

لہٰذا کسی ملک کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ علم و حکمت کا سرچشمہ تھا، ایک لایعنی بحث ہے۔ مگر مضمون نگار نے اس غیر متعلق بحث کو غیر معمولی طول دیا ہے اور پھر بھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکے:

(الف) چنانچہ کبھی تو وہ یونان کو مخزن علم و حکمت اور سرچشمۂ علوم و فنون بتاتے ہیں:

---

(1) "When it (Reflected Thought) Become Serious Sustained and logical, and directed Towards questions of life and Values it becomes Philosophy."

(Patrick: Introduction to Philosophy, P.8)

(2) "Philosophy, thus grows directly out of Life and its needs. Every one who lives, if he Lives at all Reflectively is in Some degree a Philosopher."

(Cunningham: Problems of Philosophy, P.5)

"یونان کو مخزن علم ہونے کا فخر عہدِ قدیم ہی سے حاصل ہے۔ فلسفہ اور منطق کے بڑے بڑے فضلاء یہیں سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ ابوالفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) لکھتے ہیں:

ان الاصل فی الفلسفۃ والمبدء فی الحکمۃ للروم وغیرھم کالعیال لھم کہ فلسفہ کی اصل اور حکمت کا مبدأ روم ہے اور ان کے علاوہ تمام قومیں عیال کی طرح ہیں۔"(۱)

(ب) لیکن کبھی ہندوستان اور ایران کی افضلیت کا راگ الاپتے ہیں:

"اگر حقیقت پر نظر رکھی جائے تو ہندوستان اور ایران یونان کے دوش بدوش نظر آئیں گے بلکہ یہاں تک بھی ہوگا کہ..... بعض دوسری حیثیتیں ہوں گی جن میں ہندوستان اور ایران یونان کو پیچھے چھوڑ دیں گے۔"(۲)

دوسری جگہ ہندوستان کو سرچشمہ علم بتاتے ہیں:

گویا اہل ہند نے عہد قدیم ہی میں منطق، فلسفہ، ہیئت اور طب وغیرہ تمام علوم کے اندر اتنی مہارت پیدا کرلی تھی کہ اسے سرچشمۂ علم کہا جانے لگا۔"(۳)

ایک اور جگہ وہ ہندوستان کو ایران سے افضل بتاتے ہیں:

"پھر بھی میری رائے میں ایران ہندوستان کی ہمسری اس جگہ نہیں

۱۔ برہان دہلی دسمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۶۹ سطر ۳-۶

۲۔ برہان، دسمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۶۹ سطر ۱۹ تا صفحہ ۳۷۰ سطر ۱

۳۔ برہان، فروری ۱۹۷۶، صفحہ ۱۰۲ سطر ۶-۷

کر سکتا۔[۱]"

(ج) لیکن ایک اور مقام پر وہ نہایت موکد طریقہ سے ایران کو باقی دونوں ملکوں سے افضل بتاتے ہیں:

"اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں (ایران میں) منطق کو جو ترقی ہو رہی تھی وہ اگر کچھ دنوں اور باقی رہتی تو ہندوستانی منطق کو کون کہنے جائے یونانی منطق بھی اس کے سامنے ہیچ رہ جاتی۔[۲]"

اسی طرح دوسرے مقام پر ایران کو منطق کا گہوارۂ اولین قرار دیتے ہیں:

"منطق کو کسی قوم نے ابھی مرتب نہیں کیا تھا کہ یہاں (ایران) کی منطق مرتب شکل اختیار کر چکی تھی۔[۳]"

اب سوائے اس کے کیا جا سکتا ہے کہ مضمون نگار کے ذہن میں ان چیزوں کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ۔

انان بدرد دگر ہر زماں گرفتارم
کرشمہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

بہرحال اس غیر ضروری بحث میں نہ پڑتے ہوئے کہ علم و حکمت کے ان تین سرچشموں (یونان، ایران اور ہندوستان) میں کون سب سے افضل یا سب میں

۱۔ برہان، فروری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۱۲، سطر ۳

۲۔ برہان، فروری ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۱۵، سطر ۱۳۔ ۱۵

۳۔ برہان، فروری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۱۶، سطر ۱۵

قدیم ہے، مسئلہ کے افادی پہلو پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس حیثیت سے یہ بات کمال وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جس فلسفہ نے دنیا کی دو عظیم تہذیبوں (یعنی اسلامی اور یورپی ثقافتوں) کو متاثر کر کے ان میں دیرپا اثرات چھوڑے، یونانی فلسفہ تھا، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ دونوں ثقافتیں اسی یونانی ثقافت کا تسلسل ہیں۔ بالخصوص اسلامی ثقافت جس کا آغاز خالص اور انسانی تفکیر سے غیر مشوب وحی الٰہی سے ہوا تھا۔ جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا الٰه الا انا فاعبدون۔

مگر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مقتدایان دین کی تنبیہ وسرزنش کے باوجود اس میں یہ بدیسی (یونانی) فلسفہ کچھ اس طرح سے گھل مل گیا کہ اگر آج اس ثقافت کی اس اجنبی عنصر سے تطہیر کرنا چاہیں تو عملاً ناممکن ہے۔

لہٰذا مستحسن ہوگا اگر یونانی فلسفہ کے آغاز وارتقا کے تذکرے سے پہلے اسلامی ثقافت کی تشکیل میں اس کے دیرپا اور دور رس اثرات کا تجزیہ کر لیا جائے تاکہ اس کی اہمیت اور عظمت کا کماحقہ اندازہ ہو سکے۔

یونانی فلسفہ کے اسلامی ثقافت پر اثرات

اسلامی علوم کی تین بڑی قسمیں ہیں: علوم شرعیہ، علوم ادبیہ اور علوم عقلیہ۔

آخر الذکر تو کلیتاً یونانی فلسفہ وحکمت کے (چند جزوی اضافوں کے ساتھ) عربی چربے کا نام ہے۔

رہے باقی دو علم تو ان میں سے علوم شرعیہ کی اصل تو قرآن وسنت ہیں، مگر عملی زندگی میں اس کے دو جزء ہیں: ایک ذہنی وفکری یا علم العقائد، جس کی منظم شکل علم کلام کہلاتی ہے اور دوسرا عملی یا فقہ جسے مرتب کرنے کا نام اصول فقہ کہلاتا ہے۔

علم کلام اصولاً اسی یونانی فلسفہ کی تردید و ابطال کے لئے وجود میں آیا تھا، مگر امتداد زمانہ کے ساتھ اس سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ اس درجہ خلط ملط ہو گیا کہ دونوں میں امتیاز تقریباً ناممکن ہے۔ علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

"لما نقلت الفلسفة عن اليونانية الى العربية وخاض فيها الاسلاميون وحاولوا الرد على الفلاسفة فيما خالفوا فيه الشريعة فخلطوا بالكلام كثيراً من الفلسفة ليتحققوا مقاصدها فيتمكنوا من ابطالها۔"(۱)

جب فلسفہ یونانی زبان سے عربی میں منتقل ہوا اور فضلائے اسلام نے اس میں غور وخوض کیا اور فلسفہ کے اس جزء کی تردید وابطال کی کوشش کی جو شریعت اسلامیہ کے مخالف تھا تو انھوں نے فلسفہ کے ایک بڑے جزء کو کلام میں خلط ملط کر دیا تاکہ وہ اس کے مقاصد کی تحقیق کر سکیں اور اس طرح اس کے ابطال پر قادر ہو سکیں۔

اسی طرح ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اسلامی فکر کے یہ دونوں دھارے (فلسفہ اور کلام) آخرکار قاضی ناصرالدین بیضاوی کے یہاں پہونچ کر اس درجہ گھل مل گئے کہ دونوں میں امتیاز ناممکن ہو گیا۔

"ثم توغل المتاخرون من بعدهم في مخالطة كتب الفلسفة..... والتبست مسائل الكلام بمسائل الفلسفة بحيث لا يتميز احد الفنين من الآخر۔"(۲)

پھر ان کے بعد متاخرین نے فلسفہ کی کتابوں میں خلط ملط کرنے میں انتہائی مبالغہ کیا ..... (اس طرح) کلام کے مسائل فلسفہ کے مسائل کے ساتھ اس درجہ مل گئے کہ ایک فن کا دوسرے فن سے امتیاز مشکل ہو گیا۔

(باقی)

---

(۱) تفتازانی: شرح عقائد نسفی (۲) ابن خلدون: مقدمہ